نئی امنگیں

از

اثر صہبائی، احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی، الطاف مشہدی
پرشوتم سنگھ سیٹھی، جاں نثار اختر، جذبی، جوش،
خلیق ابراہیم، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی
عبادت بریلوی، علی جواد زیدی، فراق، فیض، کمال احمد
مجاز، مسعود اختر جمال، مقبول احمد پوری، یوسف ظفر وغیرہ

مرتبہ

پرشوتم سنگھ سیٹھی

پبلشرز:- "نیا کتاب گھر" دہلی

حسب فرمائش
مکتبہ رضیہ آگرہ اور دہلی

(مطبوعہ جناح برقی پریس لال کنواں دہلی)

عرضِ ناشر

ادب اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہے۔ جدید ادب بھی آج کے افکار، تاثرات، کلچر، تہذیب اور معاشرت کا آئینہ دار ہے۔

زمانہ بدل رہا ہے —— بدل نہیں رہا ہے بلکہ بالکل بدل چکا ہے۔ پہلے لوگ فارغ البال تھے، آرام پسندی ان کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ اسی لئے اُس دور کے ادب میں غنودگی چھائی ہوئی معلوم دیتی ہے۔ اُس وقت کا شاعر کسی رئیس کی شان میں قصیدہ لکھتا یا اس کے بیٹے کی وفات پر کوئی مرثیہ لکھ دیتا تھا تو شاعرِ اعظم کا خطاب پاتا تھا۔ آج شاعر روٹی کی فکر سے آزاد نہیں ہے، وہ نہایت غیر مطمئن زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اور اُسے خود اپنی وفات پر مرثیہ لکھنا پڑتا ہے۔

بھوک اور ذلت اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی ہے۔ اور اس نے قوم کو کروٹ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ادب اس سے متاثر نہ ہو، اور بصیرت کے زاوئے نہ بدلیں۔

جدید ادب چونکہ سماج کی کشمکش سے پیدا ہوا ہے اسلئے تصور کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی طرف آ رہا ہے اور اسی لئے آج کا ادیب سماج کی نبض پر ہاتھ رکھکر اسکے دل کی دھڑکن کو سننے پر مجبور ہے —— جدید ادب جس کا دوسرا نام ترقی پسند ادب ہے، صرف اردو ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کے لٹریچر میں یہ انقلاب آیا ہے اور اردو سے پہلے آیا ہے، فرانس، اٹلی، امریکہ، اور روس کا لٹریچر وہاں کے انقلابات کے دوش بدوش رہا ہے۔ اسی طرح ایشیا، میں ترکی، مصر، اور ایران کا لٹریچر اپنی قدیم ڈگر سے منحرف ہو چکا ہے، اور کیوں نہ منحرف

ہوتا جبکہ یہ دکھائی دے رہا تھا کہ سرمایہ داری کے قلعے مسمار ہو رہے ہیں اور بھوک کی بے پناہ اذیت بری طرح محسوس ہو رہی ہے۔ اس زبردست انقلاب نے تن آسانی اور سہل انگاری کو ختم کر کے آج کے ادیب کو فطرت کے پیام پر لبیک کہنے پر مجبور کر دیا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ قدیم ادب کے دامن میں بھی بہت سے جواہر ریزے ہیں۔ اسلئے جدید ادب قدیم ادب سے بالکل منہ موڑ کر آگے نہیں جائے گا۔ بلکہ قدیم ادب کے سرمائے ہی سے جدید ادب کی تعمیر ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ جدید ادب قدیم ادب کے خلاف بغاوت نہیں ہے بلکہ اس قدیم نظم زندگی کے خلاف بغاوت ہے جس کے سبب دنیا روح فرسا معاشی عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے ——— مجھے شکایت ہے کہ نئے ادیبوں میں سے بعض نے سنجیدگی کا بالکل گلا گھونٹ دیا ہے، اور عریاں نگاری کو اپنا مقصد بنا لیا ہے گنتی کے یہ چند ادیب نئے ادب کو اپنے ارشادات عالیہ سے بدنام کر رہے ہیں۔ ان کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا اخلاقی معیار ضرور ہونا چاہیئے جسکی پابندی سے ادب میں ہیجانیت رائج نہ ہو سکے اور گندگی نہ پھیل سکے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے جدید شاعری کی فنی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند شاعر الفاظ کے انتخاب میں احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ بندشیں چست نہیں ہوتیں اور محاورے بھونڈے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ اعتراضات بعض شعراء پر صادق آئیں، لیکن اگر ہمیں ان کی جرأت فکر اور ادبی صداقت کا اعتراف ہے، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ فنی خامیاں خشک پتوں کی طرح کچھ ہی دن میں نابود ہو جائینگی —

مجھے خوشی ہے کہ مکتبہ رضیہ اپنے افتتاح کے بعد سب سے پہلے "نئی امنگیں" کے نام سے ان بلند پایہ شعراء کی نظموں کا مجموعہ پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے۔ جو جدید اور جدید تر اسکولوں کے نمائندے ہیں ؎

رضیہ سلطانہ، دہلوی

تعارف

ادب اور شاعری چونکہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ اسلئے زندگی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی کچھ ایسی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جن کا بہاؤ فطری ہوتا ہے۔ جب کبھی زندگی کی بہتی ہوئی ندی کا دھارا مُڑتا ہے تو شاعری بھی اسکے ساتھ اپنا رُخ بدل دیتی ہے۔ یہ تبدیلیاں کچھ تو شعوری طور پر پیدا کی جاتی ہیں، اور کچھ حالات و واقعات کے زیر اثر غیر شعوری طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ عموماً یہ تغیر ترقی کی منزل کی طرف ایک اور قدم ہوتا ہے۔

اُردو شاعری میں بھی ہمیشہ سے ہر دور میں اسی قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہیں، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ وہ دوسرے ممالک کے ادبیات کی طرح ارتقا کی ایک مستقل اور مسلسل داستان ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جسکو مختلف فن کاروں اور ادبی مجددوں نے تراشا خراشا اور سڈول بنا کر ایک ہیرے کی سی شکل دے دی۔

یوں تو یہ کوششیں اسی وقت سے شروع ہو گئی تھیں، جسوقت اردو شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن اس میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت آیا جب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد حالی و آزاد

نے اس فن میں جدت کی بالکل ایک نئی روح پھونکی۔ اس وقت تک اردو شاعری بڑی حد تک لکیر کی فقیر تھی یعنی وہ فارسی شاعری کی بتائی ہوئی راہوں پر چل رہی تھی۔ اس کا کوئی اپنا بنایا ہوا راستہ نہ تھا۔ اس میں تقلید کا عنصر غالب تھا۔ اس میں بہت سے ایسے نقائص بھی پیدا ہو گئے تھے جن کو کسی طرح بھی سراہا نہیں جا سکتا۔ حالی و آزاد نے مل کر اس کو ان خرابیوں سے پاک کیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس میں نئی نئی راہیں بھی نکالیں۔ اس وقت تک ہماری شاعری صرف غزل تک محدود تھی، لیکن اب اس میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی لکھی جانے لگیں۔ آزاد کی نظمیں اور حالی کی مختلف مثنویاں اور مسدس نہ صرف ادبی حیثیت سے ایک بڑے مرتبے کے مالک ہیں، بلکہ ایک بہت بڑی جدتیں بھی ہیں، جن کے اثرات اردو شاعری پر بے پناہ ہیں۔

حالی و آزاد کے ہاتھوں جب یہ جمود ٹوٹا اور ایک نیا راستہ نکلا تو اردو شاعری پہلے سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ اب نہ صرف انہیں ہیئت کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوئیں بلکہ موضوعات کے لحاظ سے بھی اس میں تنوع پیدا کیا گیا۔ آج تک وہ صرف حسن و عشق کے لئے اور اسکی مختلف کیفیات کے لئے وقف تھی، لیکن اب انسانی زندگی کے اور موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان تبدیلیوں میں سات سمندر پار کے آئے ہوئے اس سیلاب کو بھی دخل تھا جو ان دنوں ہندوستان

پر ہر لحاظ سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ یہ اثر ہندوستانی اس وجہ سے کچھ اور زیادہ قبول کر رہے تھے، کیونکہ اب وہ ذہنی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے غلامانِ فرنگ کی فہرست میں اپنا نام لکھا چکے تھے۔ ان کے نزدیک مغرب کی ہر چیز اچھی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ مغرب کے پاس ایک شاندار اور صحت مند ادب تھا، اسلئے اُسکے اثرات جن میں اس وقت تقلید کو زیادہ دخل تھا، بڑی حد تک اُردو شاعری کیلئے مفید ثابت ہوئے۔ اُردو شاعری نے اپنا اپنا کر اپنی روایات سے بالکل قطع تعلق تو نہیں کیا لیکن ہاں اپنی روایات، اور مغربی ادبیات کی تقلید کے امتزاج سے بالکل ایک نیا رنگ پیدا کیا، جو منفرد تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء سے لیکر جنگِ عظیم تک اُردو شاعری کی ترقی کی رفتار میں اگرچہ ایسی تیزی نہیں تھی جسکو ایک ادبی دور سے تعبیر کیا جا سکے، لیکن ایک چہل قدمی کا سا انداز ضرور ہے۔ لیکن جنگِ عظیم کے بعد وہ ایک دوڑ دوڑنے لگتی ہے جس میں سرور، چکبست، اقبال، عظمت اللہ خان اور جوش ملیح آبادی ہمیں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان سب نے اُردو شاعری کو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ایک ایسی بلندی پر پہنچایا جس کا اس نے اس سے قبل خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ اقبال نے اُردو شاعری کو جو ایک تفکر کا عنصر دیا، اس سے اُردو کا آنے والا ایک شاعر بھی نہ بچ سکا۔ جوش نے جو انقلاب کا ایک نعرہ بلند کیا اس پر قریب قریب ہر نئے شاعر نے لبیک کہی، اور عظمت اللہ خاں۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ سرور

چکبست وغیرہ نے ہیئت کے اعتبار سے جو تبدیلیاں کیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا
غرض یہ کہ اردو شاعری کی یہ کیفیت جنگ عظیم سے لیکر سنہ ۱۹۳۰ء تک قائم رہی۔ اس دور میں
شاعری سیدھے سادے طرز ادا کو زیادہ دخل تھا۔ گہری سے گہری اور پیچیدہ سے پیچیدہ
بات بھی سادگی اور صفائی سے ساتھ کہی جاتی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد جو شاعر آئے انھوں
نے اردو شاعری کے مروجہ طرز ادا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

اس زمانہ میں جو شاعر پیش پیش نظر آتے ہیں، اس میں ساغر، احسان دانش، روش، ڈاکٹر تاثیر،
ڈاکٹر خالد۔ فراق، ن۔م۔ راشد، میراجی۔ فیض احمد۔ جذبی، مجاز۔ احمد ندیم قاسمی، جان نثار
جان نثار اختر، عبد الحمید عدم، علی جواد زیدی، شاد عارفی، سردار جعفری، اختر الایمان، مخدوم
محی الدین، مسعود اختر جمال، الطاف مشہدی، سلام، یوسف ظفر، قیوم نظر، حبیب الرحمن
اور عبادت بریلوی خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان سب نے مل کر اردو شاعری کے مروجہ طرز ادا
اور انداز بیان کو پس پشت ڈالکر بالکل ایک نئے انداز کی بنا ڈالی جس میں فوٹو گرافی کی جگہ
مصوری کو زیادہ دخل تھا۔ ان کی شاعری میں خارجیت کی جگہ داخلیت نے لے لی۔
یہاں تک کہ بعض اپنی ذہنی الجھنوں میں ایسے پھنسے کہ مبہم بھی ہو ہو گئے۔ لیکن اس میں
شک نہیں کہ ان کا لایا ہوا انداز بیان اردو میں بالکل ایک نئی چیز تھی۔

یہ انداز بیان، نتیجہ تھا ان تحریکوں کا جو مغرب کی شاعری میں چل رہی تھیں۔ اور جن سے

اردو شاعری اب ایک جہان کی طرح متاثر ہو رہی تھی۔ حالات اب بدل چکے تھے۔ ذرائع رسل و رسائل کی برق رفتاری نے دور افتادہ سے دور افتادہ ممالک کو ایک دوسرے کا ہمسایہ بنا دیا تھا۔ اسلئے اس نئے انداز کو تقلید سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس انقلاب کا سوتا سب سے پہلے فرانس کی سرزمین پر پھوٹا۔ جب بادلیئر نے اٹھ کر نئے انداز کی ایک ایسی شمع روشن کی جسکے آگے پرانے طرز کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اور پھر اسکے پیچھے چلنے والوں یعنی رمباؤ نے ورلینا اور میلارمے وغیرہ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ انکی جدت پسندی ان کو اکثر جگہ گمراہ بھی کر دیا۔ جسکے نتیجے میں ان کی شاعری مبہم ہو گئی۔ ایسی مبہم کہ اگر اس کو گورکھ دھندا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس تحریک کے چلانے والوں کو فرانسیسی تمثیل نگار French Symbolists کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک فرانس سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اور عصر حاضر کے کسی ملک کی شاعری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اردو کی نئی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی۔ لیکن انگریزی کے توسط سے۔ چنانچہ آج ہماری شاعری میں اس تحریک اور اسی طرح کی دوسری تحریکوں کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔ ہمارے شاعر تمثیل کے پیرائے میں آج گہری باتیں کہہ رہے ہیں۔ جس میں خارجیت کی جگہ داخلیت کا عنصر غالب ہے۔ یہ مجموعہ جدید اور جدید تر دونوں اسکولوں کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ اور اردو شاعری نے پچھلے چند سالوں میں

جو ایک نئی کروٹ لی ہے۔ جو ایک نیا رُخ بدلا ہے، جو ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

آخر میں ان تمام شعراء کا شکریہ تو کردوں جنھوں نے اپنے شہ پارے اس میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ اس مجموعہ کو مرتب کرنے میں جناب عبادت صاحب اور قیمت صاحب صبا لکھنوی نے میرا ہاتھ بٹایا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ چند بلند پایہ شعراء کی نظمیں شامل نہ کر سکا۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں شامل کروں گا۔

پرشوتم سنگھ سیٹھی

جنرل سیکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین

۱۰ جون ۱۹۴۳ء

پان دریبہ، لکھنؤ

فہرست مضامین

آثر صہبائی

شادکامِ محبت

طرب انگیز ہے دنیائے محبت کی فضا
دل نے ہر رنگ میں لوٹے ہیں قیامت کے مزے

اپنے محبوب کی نظروں میں جو محبوب رہے
ہیچ ہیں اسکے لئے کوثر و جنت کے مزے

اپنی خوش بختی پہ نازاں ہوں میں اے روحِ نشاط
مجھ سے پوچھے کوئی فردوسِ محبت کے مزے

میں نے چاہا تجھے اور تو نے بھی چاہا مجھکو

ڈال کر دل پہ مرے ایک محبت کی نظر
رشکِ صد ساغرِ جم اس کو بنایا تو نے

مسکرا کر دلِ برباد کو اے رشکِ بہار
بوئے گلہائے تمنا سے بسایا تو نے

جس میں ہے مستیٔ جاوید و سرورِ ابدی
اپنے متوالے کو وہ جام پلایا تو نے

خاک سے عرش کی مسند پہ بٹھایا مجھکو!

مرے نغموں میں ہے رنگینیٔ الفت کی بہار
مری مستی میں ہے طوفانِ محبت کا خروش

نور کا ایک تلاطم ہے بپا آنکھوں میں
مری ہر موجِ نظر ہو گئی خورشید بدوش

اہلِ حکمت تو مرے پہلے ہی دیوانے تھے
آج اربابِ جنوں بھی ہیں مرے حلقہ بگوش

کچھ اس انداز کا دیوانہ بنایا مجھکو

احمد ندیم قاسمی

دیہات کی شہزادی

سورج نے ادھوری سی، جب ایک جماہی لی فطرت کے نظاروں نے محبوب نگاہی لی
پچھم نے شفق پائی، پورب نے سیاہی لی

آکاش کے پٹ کھولے، معصوم ستاروں نے نیندوں کے نقشے چھڑکے، جنت کی بہاروں نے
خوابوں میں پناہیں لیں، پرشور دیاروں نے

چپ چاپ خلاؤں میں، ظلمت کے علم کھولے سوچوں کے سمندر میں آنے لگے ہچکولے
احساس کے پنچھی نے بھیگے ہوئے پر تولے

مدہوش سی پگڈنڈی، خاموش سی چرواہی! راہوں سے شناسائی، ماحول سے آگاہی
ہاتھوں میں درانتی اور قدموں میں شہنشاہی

آنکھوں کے کٹوروں میں، دوشیزہ امنگیں ہیں باہوں کے لچکنے میں تاروں کی ترنگیں ہیں
رفتار میں مستی اور پرواز کی جنگیں ہیں

اٹھتی ہیں کبھی نظریں، جھکتی ہے کبھی گردن گرتا ہے کبھی آنچل، اڑتا ہے کبھی دامن
بلور کی چوڑی سے بجتا ہے کبھی کنگن

گاؤں کے قریب آ کر باہوں کو سمیٹے گی — چہرے کے خزانے کو آنچل میں لپیٹے گی
سو جائے گی، آنگن میں جب کھاٹ پہ لیٹے گی

جب صبح کو چڑیوں کی آواز سے جاگے گی — بھیڑوں کو نکالے گی، میدان کو بھاگے گی
نوخیز جوانی کی آسائشیں تیاگے گی

کھیلے گی شعاعوں سے، لپٹے گی ہواؤں سے — تھپکائے گی دھرتی کو، مرلی کی صداؤں سے
خلوت کو سجائے گی، گیتوں کی رداؤں سے

سورج کے بچھڑتے ہی، انگڑائیاں آئیں گی — تاروں کی نئی شمعیں، شاہراہ دکھائیں گی
اور نیرنگیاں اس کو، سوتا ہوا پائیں گی

دیہات کی شہزادی! جنگل کی مہارانی! — بے رنگ شہنشاہی! یہ بے سروسامانی!
تصویر ہے نورانی! تقدیر ہے ویرانی

میں تیری تسلی کو آزار سمجھتا ہوں — میں تیری جوانی کو بیمار سمجھتا ہوں
میں گاؤں کو پائل کا بازار سمجھتا ہوں

تو اصل میں منعم کی شطرنج کا مہرہ ہے — تو تیرہ خلاؤں میں بھٹکی ہوئی زہرہ ہے
برسے ہوئے بادل کا بیٹھا ہوا کہرہ ہے

تو صید ہے قانون و مذہب کے شغالوں کا — تو کھیل ہے شہروں کے خورشید جمالوں کا

تو ایک ذریعہ ہے سائنس کے کمالوں کا

بُجھتی ہیں تیری آنکھیں، سجتا ہے شباب اُن کا
رُکتی ہیں تیری نبضیں، بجتا ہے رباب اُن کا
لٹتی ہے تیری جنت، اُگتا ہے گلاب اُن کا

کب تک تیری دُنیا کو لوٹے گی شہنشاہی
کب تجھ کو ستائے گی، تقدیر کی کوتاہی
کب تیرے خیالوں میں تڑپے گی خود آگاہی

وہ دیکھ فضاؤں میں دوزخ سے بھڑکتے ہیں
کوندے سے لپکتے ہیں، بادل سے کڑکتے ہیں
محلوں میں تباہی کے آثار دھڑکتے ہیں

برسوں کے تعفن کو، اب دہر جھٹک دیگا
افسردہ اُمنگوں کو، کلیوں کی چٹک دیگا
کانٹوں کو مہک دے گا، پھولوں کو کھٹک دیگا

خاکستر ماضی میں، ہنگامۂ محشر ہے
اب گلشن فردا کا، بدلا ہوا منظر ہے
اب دستِ مشیت میں انصاف کا نشتر ہے

اب اپنی حقیقت کو پہچان مری رانی
اب خواب کا پیکر تو ہے صدیوں کی پیشانی
تصویر بھی نورانی ـ تقدیر بھی نورانی

ادا بدایونی

یہ جیون یونہی بیتے گا

ان گنت سانسوں کی الجھی ہوئی زنجیروں میں
زندگی ہے کہ جکڑتی ہی چلی جاتی ہے
بجھنے رہتی بھی نہیں اور بھڑکتی بھی نہیں
آگ سی ہے کہ سلگتی ہی چلی جاتی ہے

وقت کس جنتِ موہوم کا لالچ دے کر!
مجھ کو ماضی کے دھندلکوں سے اٹھا لایا ہے
میں انہیں سیمگوں کرنوں میں پروتی ہی رہی
میرے بکھرے ہوئے سپنوں کو چرا لایا ہے
ذہن پر جس طرح بیتے ہوئے لمحوں کے نقوش
جیسے بھولی ہوئی یادیں کسی افسانے میں!
اس طرح لا کے یہاں چھوڑ گیا ہے کوئی

جیسے بھٹکا ہوا راہی کسی ویرانے میں!

چلتے چلتے انہیں انجان گزرگاہوں میں
ہولے ہولے کبھی وہ وقت بھی آجاتا ہے
کائنات ایک ہی آنسو میں سمٹ آتی ہے
زد پہ آندھی کی دیا کانپ رہا ہو جیسے!!
تھک کر افسردہ و ویران گزرگاہوں میں!
آخری عہدِ وفا ہانپ رہا ہو جیسے
اور یہ آنسو ہے کہ پلکوں سے ڈھلکتا بھی نہیں!
ہائے یہ ساغرِ لبریز چھلکتا بھی نہیں

اسرار الحق، مجاز

دوست سے!

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو حُسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و رُوح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تہذیبِ عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی
ابھی انسانیت دولت سے ٹکّر لے نہیں سکتی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے، حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری!
ابھی ہے اک حسیں تحریکِ طوفاں منتظر میری

ابھی شاید ہے اک زنجیرِ زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انساں سے آنکھیں ملانا ہے!
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامالِ جورِ آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہر دشمنِ نظمِ کہن کے گیت گانا ہیں
ابھی ہر لشکرِ ظلمت شکن کے گیت گانا ہیں
ابھی خود سر فروشانِ وطن کے گیت گانا ہیں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بہ ایمائے حمیت جان کی بازی لگاتا ہوں!
میں جاؤں گا، میں جاؤں گا، میں جاتا ہوں، میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

((جوش))

شام حسین

تغیّر

پہلے

تھا محبت میں وہ بھی دور کبھی
رات دن چاندنی برستی تھی
گرچہ ہر لمحہ وقفِ عشرت تھا
زندگی وقت کو ترستی تھی
راہِ الفت کی سخت منزل میں
ہر قدم استوار تھا اپنا
خوب پیتے تھے مے اُن آنکھوں سے
نشہ پر اختیار تھا اپنا

اور اب

اب لرزتے ہیں ہر قدم پہ پاؤں

Imp

اَب محبت سُبک خرام نہیں
جن سے پی کر قرار آتا تھا
حیف ان آنکھوں میں اب وہ جام نہیں

ٹوٹ جاتی ہو بار بار جو ڈور
اس میں گرہیں لگائیں گے کب تک
عقل جب راستہ دکھاتی ہو
دل کے دھوکے میں آئینگے کب تک

دل تو دھوکے میں رہ بھی سکتا ہے
عقل کب تک فریب کھائیگی
یونہی گر ٹوٹتی رہی تو یہ ڈور
آخری بار ٹوٹ جائے گی!

الطاف مشہدی

پگڈنڈی

سونے چاندی کے بچھو بیٹھے ہیں تاک لگائے
کب کوئی انجان مسافر اس رستے پر آئے
زہر اُن کا بھٹکے راہی کو موت کی نیند سُلائے

ناداری کے جبڑوں میں دَم توڑے وہ دکھیارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

حرص و ہوا کا طوفاں ہے اور ڈرز ڈر ڈر بھیٹ بھٹ
چیخیں، آنسو، آہیں، نالے اور کلوں کی کھٹ کھٹ
ہر سو ایک قیامت برپا ہر جانب اک کھٹ پٹ

فطرت کی آنکھوں سے بہہ نکلی ہے خونیں دھارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

رینگ رہے ہیں دھرتی کے سینے پر خونیں سائے
انگڑائی لیتا ہے، ذرّے ذرّے میں اندھیارے

بگڑے موسم میں منزل تک کس سے جایا جائے
کرودھ کپٹ کی زہری ناگن اور انسان بچارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

ننگے ہیں افلاس کے پاؤں اور کانٹے زہریلے
میٹھی نظریں، کومل چہرے، ہردے کے پتھریلے
بانکے ترچھے، رنگ برنگے، نیلے، کالے، پیلے
چھنتے ہیں سینے کی ٹھنڈک، آنکھوں کا اجیارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

موڑوں سے بھرپور ہے رستہ ہر موڑ ایک خرابی
قدم قدم پر جابر دھوکے ڈگر ڈگر بیتابی
آشاؤں کی زندہ نعشیں، چنتا مست شرابی
ڈوب چلا ہے غم کے بادل میں جیون کا تارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا!

بھوکی نظریں، بکھرے جوبن پر جھکتی ہیں ایسے
ویرانے میں پردیسی کی نعش پہ چیلیں جیسے

یا سندر جوگن کی تھالی پر تانبے کے پیسے!

لو بھڑکی اگن بھڑک اُٹھی ہے پاکر پاپ سہارا
آن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

آگ کی ندی بہتی ہے چلتے ہیں خون کے نالے
ڈسنے والی لہریں ہیں یا ستم آلودہ بھالے
پڑے ہوئے ہیں اب تک قدرت کے ہونٹوں پر تالے

رعشہ ہاتھوں میں شل پاؤں سر پر بوجھ کا بھارا
آن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

جی کہتا ہے اس پگڈنڈی کو ہموار بنا دوں
تاریکی کو روشن کر دوں جلتے دیپ بجھا دوں
پستی کو دوں عرش کی رفعت عرش کو فرش بنا دوں

خواب سے چونکے غافل انساں جاگے عالم سارا
آن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

اختر الایمان نجیب آبادی

جبر

زرد پتوں کا وہی ڈھیر وہی دورِ خزاں
خشک شاخیں ہیں ابھی منتظرِ فصلِ بہار
مرگِ انبوہ سے کچھ کم تو نہیں ہے یہ سماں
کتنا جانکاہ تسلسل ہے وہی لیل و نہار

اس قدر ناز نہ کر پھول سے رخساروں پر
زندگی بھیک ہے جو جبرِ مشیت سے ملی
حسن بے مایہ ملا تجھ کو، مجھے تشنہ دلی

ہم بھکاری ہیں، بھکاری کی حقیقت کیا ہے
ایک کشکول گدایانہ لئے پھرتے ہیں!
منظرِ عام پہ، ویرانوں میں، آبادی میں
سب ہی بے بس ہیں، سبھی ہونٹ لئے پھرتے ہیں
اپنی مجبوری کا شاید تجھے احساس نہیں

ایک دھندلی سی کرن بھی نہ ملے مانگے سے
لب ہلائیں تو یہ سورج، یہ قمر بھی چھن جائے
ہاتھ اٹھائیں تو دعاؤں سے اثر بھی چھن جائے
اشک چھن جائے، نگاہوں سے حرارت چھن جائے
ظلم پروردہ جوانی سے تجسّت چھن جائے
حسن اک ٹھیس کی صورت میں بدل کر رہ جائے
ظلمتِ یاس میں اک آہ مچل کر رہ جائے

پرشوتم سنگھ سیٹھی

ناکامِ سعی

حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں جد وجہد تیری
تری یہ کاہشِ پیہم، ترے آڑے نہ آئے گی!
یہ تیرا عزمِ ناکارہ، فریبِ راہِ منزل ہے
ہلاکت ابتدا اسکی، ہلاکت اس کا حاصل ہے!

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی، کبھی فطرت نہ بدلے گی
تو چاہے جتنا سر مارے، کبھی قدرت نہ بدلے گی

امیدوں کے سہارے جی رہا ہے کس لئے ناداں؟
تصور کے محل کب تک بنائے گا تو لے انساں؟
اگر جینا ہے خود کو ڈھال تو فطرت کے سانچے میں
نہیں ممکن ذرا رد و بدل نیچر کے ڈھانچے میں
تری آنکھوں میں طوفاں کے آثار، یہ مانا

ترے ہاتھوں میں ہے ادراک کی تلوار، یہ مانا
بدل سکتا ہے تو ماحول و گردش بھی، لیکن
عناں قدرت کی تیرے ہاتھ میں آ جائے، ناممکن
ہزاروں زلزلے آئیں، ہزاروں آندھیاں آئیں
زمانے بھر کے طوفانوں کی موجیں اس سے ٹکرائیں
رہے گی ثابت و سالم مگر چٹان یہ یونہی
نہ بدلی ہے، نہ بدلے گی، کبھی فطرت نہ بدلے گی
تری سب یورشیں بیکار ثابت ہونگی بالآخر!
زمانہ رخ نہ بدلے گا کبھی اپنا تری خاطر!

نہیں ممکن ذرا رد و بدل نیچر کے ڈھانچے میں
اگر جینا ہی، خود کو ڈھال تو فطرت کے سانچے میں

جاں نثار اختر

زندگی کے موڑ پر

ہنس رہی ہے روبرو رنگیں بہار
کتنے نظارے ہیں جنت در کنار

راستہ تکتی ہے کب سے رہ گزار
دیکھتا ہوں مڑ کے لیکن بار بار

آ گیا ہوں دور کس کو چھوڑ کر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

کتنے ہونٹوں پر ہے عہدِ دلنشیں
بڑھ رہے ہیں کتنے دستِ نازنیں
منتظر ہیں کتنے آغوشِ حسیں!
مجھ کو لیکن ہے نہ جانے کیا یقیں!

رہ گئی ہے جم کے اک جانب نظر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

ہو چلی ہیں گُل اُفق کی سرخیاں
تیرگی ہے کارواں در کارواں
بجھ چکا ہے جیسے نظروں میں جہاں
کچھ نہیں معلوم جانا ہے کہاں

ظلمتوں میں کھو گئی ہے رہگذر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

جوش ملیح آبادی

تعاقب

مرد ہو، عشق سے جہاد کرو — اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو
دِل سے بیتے دنوں کی یاد مٹاؤ — نہ تو آپ خود ہی رو، نہ مجھ کو رلاؤ
بھول جاؤ کہی سُنی باتیں!! — نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں
نہ تو وہ موڑ ہیں نہ وہ گلیاں — نہ تو وہ پھول ہیں نہ وہ کلیاں
اس جہاں سے گذر چکی ہوں میں — اب یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں
ایک دکھیا کو اور اب نہ ستاؤ — بن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ

مرد ہو، عشق سے جہاد کرو
اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو

میرے کانوں میں، میرے سینے میں — گونجتی رہتی ہیں یہ آوازیں
جس طرف جاؤں دِل ہلاتی ہیں! — یہ مرے ساتھ ساتھ جاتی ہیں
بادِ جاں بخش سے، بگولوں سے — سخت کانٹوں سے نرم پھولوں سے
یہ صدائیں برابر آتی ہیں! — دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں

۲۹

بھول جاؤ کہی سُنی باتیں
نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں
مرد ہو، عشق سے جہاد کرو!
اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو

تنگ آ کر جدھر بھی جاتا ہوں
ان صداؤں کو ساتھ پاتا ہوں

صحنِ گیتی سے، اوجِ گردوں سے
تابِ انجم سے، آبِ جیحوں سے

بحرِ مواج کے حبابوں سے
حکمت و شعر کی کتابوں سے

شورشوں، غلغلوں، دھماکوں سے
تیز رو گاڑیوں کے پہیوں سے

شعرگوئی سے، شعرخوانی سے
ہر حقیقت سے، ہر کہانی سے

شورِ جلوت، سکوتِ خلوت سے
جنبشِ ضو، جمودِ ظلمت سے

معبدوں سے، شراب خانوں سے
مطربِ خوش نوا کی تانوں سے

بوئے عنبر سے، بادِ صرصر سے
روئے خوباں سے، سنگِ مرمر سے

قصرِ منعم سے، قبرِ مفلس سے
پائے طاؤس و چشمِ نرگس سے

جان و گوہر سے، روحِ نسریں سے
موجِ سنبل سے، اوجِ پرویں سے

باغ سے، مدرسے سے، جنگل سے
تپتے سورج، برستے بادل سے

یہ صدائیں برابر آتی ہیں ! دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں

بھول جاؤ کہی سنی باتیں

اب نہ وہ دن ہیں اور نہ وہ راتیں

ایک دکھیا کو اور اب نہ ستاؤ

بن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ

اس جہاں سے گذر چکی ہوں میں اب یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں

مرد ہو، عشق سے جہاد کرو

اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو

خلیق ابراہیم

ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آنہیں سکتا

ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آنہیں سکتا

شراب آسا تمناؤں کو دل میں لا نہیں سکتا

محبت اور صداقت کو ابھی جھٹلا نہیں سکتا

ابھی خود اپنے ہاتھوں رُوح کو جھلسا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

یہ مانا دل کی بربادی محبت کا قرینہ ہے
محبت زیست کے گرداب میں نازک سفینہ ہے
سفینے میں صداقت اور عفت کی حسینہ ہے
حسینہ کے دلِ مضطر کو یوں ٹھکرا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

اگرچہ دردِ ناکامی خجالت ساتھ لاتا ہے
خجالت ساتھ لاتا ہے ندامت ساتھ لاتا ہے
ندامت ہی نہیں بلکہ جراحت ساتھ لاتا ہے
مگر میں ایسے چرکوں سے ابھی گھبرا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ابھی ہے دیو دولت کی کلائی موڑنا باقی
سماجی بندشوں کو بھی ابھی ہے توڑنا باقی
ابھی اُلفت کا رشتہ حسن سے ہے جوڑنا باقی

ابھی ٹوٹے ہوئے دل کی ہنسی اُڑوا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ابھی تو عشق کو تعمیرِ نو کا گُر سکھانا ہے
جفاؤں کو وفا کے آستاں پر سر جھکانا ہے
ابھی عفت کا قلبِ حسن پر سکّہ بٹھانا ہے
کہیں ناموسِ الفت کو کبھی لُٹوا نہیں سکتا
ابھی تو میں طربُ کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ابھی تو عشق کی تنہائیوں کو آزمانا ہے
ابھی تو حسن کی رعنائیوں کو آزمانا ہے
ابھی تو بزم کی برنائیوں کو آزمانا ہے
ابھی تو میں فریبِ عیش و عشرت کھا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

زمانہ ہو گیا اُس کے شکستہ عہد و پیماں کو
بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے اُس روئے خنداں کو
مگر اب تک کھٹک محسوس ہوتی ہے رگِ جاں کو

ابھی تو میں نشاط انگیز نغمے گا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

لُبھاتی ہے مجھے یہ مے کے پیمانوں کی رنگینی
رِجھاتی ہے مجھے ساقی کے رُخساروں کی رنگینی
بُلاتی ہے مجھے پُر شوق ارمانوں کی رنگینی
ابھی لیکن میں تابِ رنگِ محفل لا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

مرے جذبات کو انگڑائی پر انگڑائی آتی ہے
کوئی رقاصہ جیسے توڑا لیکے بیٹھ جاتی ہے
مری فطرت مری مجبوریوں کو مُنہ چڑاتی ہے
اگرچہ فطرتِ انساں کو بھی جھٹلا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

ضمیر اب تک مری راہوں میں آ کر مسکراتا ہے
غم و حرمان و جذبِ شوق کی شمعیں جلاتا ہے
ابھی تو ایک آنسو چشمِ تر میں جھلملاتا ہے
یہ آنسو خاک کی آغوش میں کملا نہیں سکتا
ابھی تو میں طرب کی محفلوں میں آ نہیں سکتا

سلام مچھلی شہری

انتقام

نگاہیں مری کچھ فسردہ اٹھی تھیں — یہ نرگس کے غنچے تو خنداں ہیں لیکن
مرے ہاتھ ناواقفِ بندگی تھے — یہ تاروں کی شاخیں تو رقصاں ہیں لیکن
مرے ہونٹ تھے سازِ نغمہ پہ ساکت — شفق کی تو لہریں غزل خواں ہیں لیکن

اسی آنکھ میں سرخ بھنوروں کو لے کر — چمن کی روش پر سلایا ہے میں نے
اسی ہاتھ میں نیل کی ناگنوں کا — کئی بار زہر آزمایا ہے میں نے
اسی ہونٹ پر آگ کو سرد کر کے — اثر بجلیوں کا دبایا ہے میں نے

میں زہریلی نظریں اٹھاؤں تو لیکن — کنول کے یہ دو پھول مرجھا نہ جائیں
انہیں ناگنوں سے ڈساؤں تو لیکن — یہ مرمر کی شاخیں سکوں پا نہ جائیں
اثر اپنے ہونٹوں میں لاؤں تو لیکن — یہ لہریں شعاعوں سے ٹکرا نہ جائیں

یہ ہونٹ اور یہ بازو، یہ نازک نگاہیں
یہ کانوں میں ماحول کی سرد آہیں

شاد عارفی

غمّازہ

"ساقی دہلی" میں دیکھی تو نے میری نظم "یاد"
یعنی حاصل ہے تجھے میری وفا کا اعتماد

ضبطِ غم پائندہ باد و ربطِ باہم زندہ باد
پھر خطوں میں "مجھ کو بھولے تو نہیں" سے کیا مراد

بیوفائی کا گماں مجھ پر فریبِ تازہ ہے
تیرے اس جملہ کے پردہ میں کوئی غمازہ ہے

وہ تری چنچل سہیلی "یاسمین" "رشکِ خو"
جس کو رہتی تھی مرے اشعارِ نو کی جستجو!

جو سنا کرتی تھی چھپ چھپ کر ہماری گفتگو
گدگداتی تھی وہ مجھ کو اور جھلاتی تھی تو

لیٹ جاتی تھی مرے بستر پہ تیرے سامنے
"دھار ٹھنڈے سانس کے خنجر" پہ تیرے سامنے

ہونٹ دانتوں میں دبا کر "آنکھ دے کر" بار بار
چاہتی تھی مجھ سے تنہائی میں "قربِ ناگوار"

"تیز بوسوں" کے لئے "پیاسے ارادے" بیقرار
"لمسِ حظ افزا" سے "شدت خواہ" "سینے کا ابھار"

ہاں وہی پہنچی ہے تیرے کان بھرنے کیلئے
"آخری تدبیر" مجھ کو رام کرنے کیلئے

یہ "معمّہ" یہ "پہیلی" تجھکو سمجھاتا چلوں
"یاسمیں" کی آرزو سے دل کو بہلاتا چلوں

"خلوتِ محدودِ تن" کے لمحوں کو شرماتا چلوں
"جذبۂ مخصوص" کے ہاتھوں سے کتراتا چلوں

چھ سے مدعو کیا جاتا ہوں اک دن چائے پر
چائے پی چکنے پہ "وہ گرندۂ تغزل" الحذر

بیٹھ کر نزدیک میرے۔ والہانہ شان سے
مسکرائی۔ اور کہا "کہتی ہوں دل سے جان سے

"ضبطِ اظہارِ طلب" باہر ہے اب امکان سے
پھر یہ بدمستی "کہ میں باہر نہیں" ہیجان سے

تجھسے "عہدِ اُلفت" سے لوٹ آڑے آگیا
یاسمیں کا "انصرامِ شوق" منہ کی کھا گیا

اَب وہ اس "تردیدِ رغبت" کا صلہ دینے کو ہے
اَب وہ اس "توہینِ عشرت" پر سزا دینے کو ہے

اب وہ اس "تذلیلِ خلوت" میں دغا دینے کو ہے
اَب وہ اِس "احساسِ عفت" کی دوا دینے کو ہے

چاہتی ہے مجھکو "نشۂ ہوس" میں گھیر لے
بن پڑے جس طرح بھی، مجھ سے ترا دل پھیر لے

تُم ملا سے۔ جان کر اُس کو امین و راز دار
تجھ سے جو چالیں چلے گی، کہہ گئی دیوانہ وار

صُبحدم اُس نے کئے وہ "مکر" مجھ پر آشکار
چونکہ تیرے پاس جا پہنچی ہے وہ "غیبت شعار"

اسلئے جو کچھ کہے گی وہ، سُناتا ہوں تجھے

سلے

مجھ پہ جو بہتان باندھے گی بتاتا ہوں تجھے

یوں کہے گی۔ سن! مری جانی ہے تو جسکے لئے
جانتی بھی ہے کہ وہ "محدود" ہے کس کیلئے

آج کل غزلیں لکھا کرتا ہے نرگس کے لئے
ایک نرگس کیا۔ اجی "اسکے لئے" "اسکے لئے"

اے بہن میں اس کی "آوارہ مزاجی" کیا کہوں
کہہ رہی تھیں کل جو ہمسائی سے "باجی" کیا کہو

روز "فسخِ عہدِ الفت" روز "تازہ میل جول"
دوسے "سائی" اور "بدھائی" تیسری سے "مول تول"

شرع کہتی ہے کسی کے عیب لوگوں پر نہ کھول
عافیت چاہئے تو ایسے بیوفا سے اب نہ بول

جسکی خلوت شاہدانِ ناز سے معمور ہے
جسکی وارفتہ شعاری۔ عام ہے مشہور ہے

"عشرتِ ہر ہر نفس" ہے۔ اس کا مطلب اور بس
"عشق" سے "فعلِ مگس" ہے اس کا مطلب اور بس

خوشنما پھولوں کا رس ہے اس کا مطلب اور بس
گلستاں پر دسترس ہے اس کا مطلب اور بس

بس کوئی "نورس کلی" ہر روز اس کو چاہیئے
روز اک جامِ نشاط اندوز اس کو چاہیئے

صہبا لکھنوی

ناچ

ہاں ناچ، وُہی ناچ، کنول رُوپ، مدھر ناچ
ہر تال کی لہروں میں فضاؤں کو بہا دے
گھنگھرو کی چھنا چھن، ترے اعضا کا حسیں لوچ
ہاں تھم کے ذرا مرمریں باہوں کو گھما دے

اک نشہ سا برساتے ہوئے، نین کٹورے
ہونٹوں پہ تبسّم کے جنوں خیز قرینے
مہتاب کی شمعوں میں ترے رقص کا پرتو
آفاق کی وسعت میں دھڑکتے ہوئے سینے

یہ تیرا حسیں ناچ ہے یا شیام کی مُرلی
جو ارض و سما، کون و مکاں، ناچ رہے ہیں

٣٩

سیماب کی مانند میرے رقص کی ہلچل
ہاں تیری طرح سارے جہاں ناچ رہے ہیں

عالم ہمہ بدمست ہے بیخود ہیں فضائیں
کھویا ہوا احساس ہے، ڈوبے ہوئے جذبے
ہیں اور تیرے ساعقہ انداز اشارے
بس تھم کے گلے ملنے کو ہیں سانجھ سویرے

اِک گردشِ ہنگام ہے دیوی مرا گلشن
بھونرے ہیں کہ منڈلاتے ہیں جیون کی کلی پہ
روتا ہوں تو ہنستے ہیں مرے باغ کے مالی
کہتے ہیں سدا ناچ ہے جگ کا پسِ منظر

لیکن تجھے کیا، ناچ اس انداز سے پیہم
ٹھوکر سے تیری لرزہ بہ انداز ہو عالم

عبادت بریلوی

منزل

اس بھیانک سیاہ جنگل میں ہے بسیرا جہاں درندوں کا
بھوت بن کر جہاں ڈراتا ہے گنگناتا ہوا سا سناٹا
میں اکیلا ہوں اپنی دھن میں رواں
زندگانی کے گیت گاتا ہوا
اس بیاباں پہ مسکراتا ہوا
ایک بھی آدمی نہیں ہے جہاں
موت کی سی جو اس خموشی پر زندگانی کے گیت گا گا کر
آتشیں قہقہے لگاتا ہوا

(۲)

ایک روشن چراغ پیشِ نظر دور جنگل میں ٹمٹماتا ہوا
اک اشارے کے ساتھ رہ رہ کر اپنی جانب مجھے بلاتا ہوا
دور افق پر اندھیری راتوں میں

اک ستارہ ہو جس طرح خنداں
تیرگی کی فسردہ بستی میں
جسکے باعث ہو روشنی رقصاں

مست ہو ہو کے مسکراتی ہوئی بھیرویں کے سے راگ گاتی ہوئی

اپنی دِھیمی خموش تانوں میں

(۳)

روشنی کا غبار بڑھنے لگا
صبح نو جیسے مسکراتی ہو

لی اُمنگوں نے دل میں انگڑائی
مطربہ کوئی جیسے گاتی ہو

تیز ہونے لگے قدم ہمدم گرم سانسوں کے اُف یہ پیچ و خم
سر بلند ہو کے مسکرانے لگا آسمانوں پہ شوق کا پرچم

خود بخود مست کیوں نہ ہو جاؤں
گیت اُمنگوں کے ساز پر گاؤں
اَب پہونچنے میں دیر ہی کیا ہے!

علی جواد زیدی

ٹھوکے

یہ المناک جنوں خیز، ستم گر راتیں
جانے کیا چپکے سے کہہ دیتی ہیں سو جاتی ہیں

اور تنہائیوں کی بزم میں بجھتی شمعیں
بجھتے بجھتے مری پلکوں کو بھگو جاتی ہیں

چند آہیں مری حسرت کو ٹھوکے دے کر
غم امروز کے ویرانوں میں کھو جاتی ہیں

میں جو تصویریں بناتا ہوں تمناؤں کی
وہ بھی ہنستے ہوئے اغیار کی ہو جاتی ہیں

شہد بھی تلخ ہے اتنا، مری ہمدم! یہ کیوں؟

بات کیا ہے کہ تری جلوہ گہ ناز میں بھی
میری محبوبہ! مری تلخ نوائی نہ گئی

مسکراتے ہوئے فانوس لٹاتے رہے نور
روشنی دل کے سیہ خانے میں آئی نہ گئی

کھینچ لایا تھا مجھے جس کیلئے شوق یہاں
وہ مسرت ترے کاشانے میں پائی نہ گئی

اس شبستاں میں بھی خالی ہوئے ساغر لاکھوں
آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی

میری عشرت سے ہے وابستگی غم، یہ کیوں؟

کیا مرے دل میں نہیں عشرت امروز کا شوق
کیا مرے واسطے اک لمحہ لذت بھی نہیں؟

جس سے ڈھل جائے تھکے پاؤں میں لپٹی ہوئی گرد
کیا ترے بس میں وہ پایاب محبت بھی نہیں

جو مٹا دے مرے ماتھے سے شکن کے آثار
کیا ترے پاس وہ پھیکی سی مسرت بھی نہیں

دُور کر دے جو مری فکر کے چہرے سے غبار
کیا مرے حصّہ میں وہ عکسِ لطافت بھی نہیں

حق تو سب کچھ تھا مگر مجھکو ملا کم، یہ کیوں؟

چند بہکے ہوئے مے کش تو سبھی کچھ پی جائیں
اور بس رندِ خرابات نشیں ہیں ہم لوگ

حیف دیکھے نہیں دُنیا نے ابھرتے سینے
وہ سمجھتی ہے کہ کوتاہ جبیں ہیں ہم لوگ

ہم جو اُبلیں تو یہ سب میکدہ بہہ جائے ابھی
وہ تو کہیے کہ تنک ظرف نہیں ہیں ہم لوگ

اور اُبلنا بھی پڑے گر تو کوئی بات نہیں
مفتیٔ شرع تو کیا بانیٔ دیں ہیں ہم لوگ

پھر نہ کہنا کہ تری بات ہے مبہم، یہ کیوں؟

فراق گورکھپوری

شامِ عیادت

یہ کون مسکراہٹوں کا کارواں لئے ہوئے
شباب و شعر و رنگ و نور کا دھواں لئے ہوئے

دھواں کہ برقِ حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی
چٹیلی زندگی کی شادمانیاں لئے ہوئے

لبوں سے پنکھڑی گلاب کی حیات مانگے ہے
کنول سی آنکھ سو نگاہ مہرباں لئے ہوئے

قدم قدم پہ دیے اُٹھی ہے نوزبیتِ رہگذر
اَدا اَدا میں بے شمار بجلیاں لئے ہوئے

نکلتے بیٹھتے دلوں کی آہٹیں نگاہ میں
رسیلے ہونٹ فصلِ گُل کی داستاں لئے ہوئے

خطوطِ رُخ میں جلوہ گر وفا کے نقش سربسر
دلِ غنچہ میں کُل حسابِ دوستاں لئے ہوئے

وہ مُسکراتی آنکھیں جن میں رقص کرتی ہے بہار
شفق کی گُل کی بجلیوں کی شوخیاں لئے ہوئے

ادائے حُسن برق پاش، شعلہ زن، نظارہ سوز
فضائے حُسن اودی اودی بدلیاں لئے ہوئے

جگانیوالے نغمۂ سحر لبوں کے ساز میں
نگاہیں نیند لانے والی لوریاں لئے ہوئے

وُہ نرگسِ سیاہ، نیم باز، میکدہ بدوش
اندھیری مست راتوں کی جوانیاں لئے ہوئے

تغافل خمار اور بے خودی کی اوٹ میں
نگاہیں اک جہاں کی ہوشیاریاں لئے ہوئے

ہری بھری رگوں میں وُہ چھلکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اِک جہاں لئے ہوئے

زفرق تا قدم تمام چہرہ جسم نازنین
لطیف جگمگاہٹوں کا کارواں لئے ہوئے

"تبسمش تکلمے، تکلمش ترنمے"
نفس نفس میں تھرتھراتا سازِ جاں لئے ہوئے

جبینِ نور جس پہ پڑ رہی ہے نرم چھوٹ سی
خود اپنی جگمگاہٹوں کی کہکشاں لئے ہوئے

ستارہ بار، مہ چکان و خور فشاں جمالِ یار
جہانِ نور کارواں بہ کارواں لئے ہوئے

وہ زلف خم بہ خم شمیمِ مست سے دھواں دھواں
وہ رُخ چمن چمن بہار جاوداں لئے ہوئے

بہ مستیِ جمال کائنات خوابِ کائنات
بہ گردشِ نگاہ دورِ آسماں لئے ہوئے

یہ کون نوبہار ناز آیا، عضو عضو میں
جوانیاں، جوانیوں میں آندھیاں لئے ہوئے

یہ کون آنکھ پڑ رہی ہے، مجھ پہ اتنے پیار سے
وہ بھولی سی وہ یاد سی کہانیاں لئے ہوئے

یہ کس کی مہکی مہکی سانسیں تازہ کر گئیں دماغ
شبوں کے راز، شبنموں کی نرمیاں لئے ہوئے

یہ کن نگاہوں نے مرے گلے میں باہیں ڈال دیں
جہان بھر کے دکھ سے درد سے اماں لئے ہوئے

نگاہِ یار دے گئی مجھے سکونِ بے کراں
وہ بے کہی وفاؤں کی گواہیاں لئے ہوئے

مجھے جگا رہا ہے موت کی غنودگی سے کون
نگاہوں میں سہاگ رات کا سماں لئے ہوئے

مری فسردہ اور بجھی ہوئی جبیں کو چھو لیا
یہ کس نگاہ کی کرن نے ساز جاں لئے ہوئے

ستے سے چہرے پہ حیات رسمسائی مسکرائی
نہ جانے کب کے آنسوؤں کی داستاں لئے ہوئے

تبسم سحر ہے اسپتال کی اداس شام
یہ کون آ گیا نشاط بے کراں لئے ہوئے

مرا وہ رس کا پتلا، آنکھوں کا ستارہ آ گیا
نظر نظر میں التفات شادماں لئے ہوئے

ترے نہ آنے تک اگرچہ مہرباں تھا اک جہاں
میں رو کے رہ گیا ہوں سو غم نہاں لئے ہوئے

تو آ گیا، تو آ گیا یہ شام جگمگا اٹھی!
بہار لہلہا اٹھی شمیم جاں لئے ہوئے

فضائے اسپتال ہے کہ رنگ و بو کی کروٹیں
ترے جمال لالہ گوں کی داستاں لئے ہوئے

فراق آج پچھلی رات کیوں نہ مر رہوں کہ اب
حیات ایسی شامیں ہو گی پھر کہاں لئے ہوئے

(۲)

مگر نہیں کچھ اور مصلحت تھی اس کے آنے میں
جمالِ دیدِ یار تھے نیا جہاں لئے ہوئے

اسی نئے جہاں میں آدمی بنیں گے آدمی
جبیں پہ شاہکارِ دہر کا نشاں لئے ہوئے

اسی نئے جہاں میں آدمی بنیں گے دیوتا
طہارتوں کا فرقِ پاک پر نشاں لئے ہوئے

خدائی آدمی کی ہوگی اس نئے جہان پر
ستاروں کے ہیں دل پہ پیشگوئیاں لئے ہوئے

سلگتے دل شرر فشان و شعلہ بار برق پاش!
گذرتے دن حیاتِ نو کی سرخیاں لئے ہوئے

تمام قول اور قسم نگاہِ نازِ یار تھی!
طلوعِ زندگیِ نو کی داستاں لئے ہوئے

نیا جنم ہوا مرا کہ زندگی نئی ملی
جیوں گا آج شام کی نشانیاں لئے ہوئے

نہ دیکھا آنکھ اٹھا کے عہدِ نو کے پردہ داروں نے
گذر گیا زمانہ یادِ رفتگاں لئے ہوئے

ہم انقلابیوں نے یہ جہاں بچا لیا مگر
ابھی ہے اک جہاں وہ بدگمانیاں لئے ہوئے

(۳)

نئے زمانے میں اگر اداس خود کو پاؤں گا
یہ شام یاد کر کے اپنے غم کو بھول جاؤں گا

عیادتِ حبیب سے وہ آج زندگی ملی!
خوشی بھی چونک چونک اٹھی غم کی آنکھ کھل گئی

اگرچہ ڈاکٹر نے مجھ کو موت سے بچا لیا
پر اس کے بعد تیری آنکھ نے مجھے جلا لیا

نگاہِ یار تجھ سے اپنی منزلیں میں پاؤں گا
تجھے جو بھول جاؤں گا تو راہ بھول جاؤں گا

(۴)

Imp

قریب تر میں ہو چلا ہوں دکھ کی کائنات سے
میں اجنبی نہیں رہا حیات سے ممات سے

وہ دکھ سہے کہ مجھ پہ کھل گیا ہے درد کائنات
ہے اپنے آنسوؤں سے مجھ پہ آئینہ غم حیات

یہ بے قصور جاندار درد جھیلتے ہوئے
یہ خاک و خوں کے پتلے اپنی جاں پہ کھیلتے ہوئے

وہ زیست کی کراہ جس سے بیقرار ہے فضا
وہ زندگی کی آہ جس سے کانپ اٹھتی ہے فضا

کفن ہے آنسوؤں کا دکھ کی ماری کائنات کا
حیات کیا، انہیں حقیقتوں سے ہو با خبر

جو آنکھ جاگتی رہی ہے آدمی کی موت پر
وہ ابر رنگ کو بھی دیکھتی ہے سادہ تر

سکھا گیا ہے دکھ مرا پرائی پیڑ جاننا
نگاہ یار تھی یہاں بھی آج میری رہ نما

یہی نہیں کہ مجھکو آج زندگی نئی ملی!
حقیقت حیات مجھ پہ سو طرح سے کھل گئی!

گواہ ہے یہ شام اور نگاہ یار ہے گواہ
خیال موت کو میں اپنے دل میں اب نہ دونگا راہ

جیوں گا ہاں جیوں گا اے نگاہ آشنائے یار
سدا سہاگ زندگی ہے اور جہاں سدا بہار

(۵)

ابھی تو کتنے ناشنیدہ نغمۂ حیات ہیں
ابھی نہاں دلوں میں کتنے راز کائنات ہیں!

ابھی تو زندگی کے ناچشیدہ رس ہیں سینکڑوں
ابھی تو ہاتھ میں ہم اہل غم کے جس ہیں سینکڑوں

ابھی وہ لے رہی ہیں میری شاعری میں کروٹیں
ابھی چمکنے والی ہیں چھپی ہوئی حقیقتیں!

ابھی تو بحر و بر پہ سو رہی ہیں میری وہ صدائیں
سمیٹ لوں انہیں تو پھر وہ کائنات کو جگائیں

ابھی تو روح بن کے ذرّے ذرّے میں سماؤں گا
ابھی صباح بن کے میں افق پہ تھرتھراؤں گا

ابھی تو میری شاعری حقیقتیں لٹائے گی!
ابھی مری صدائے درد اک جہاں پہ چھائے گی!

ابھی تو آدمی اسیرِ دام ہے غلام ہے
ابھی تو زندگی صدِ انقلاب کا پیام ہے

ابھی تمام زخم و داغ ہے تمدّنِ جہاں
ابھی رخِ بشر پہ ہیں بہیمیت کی جھائیاں

ابھی مشیّتوں پہ فتح پا نہیں سکا بشر
ابھی مقدّروں کو بس میں لا نہیں سکا بشر

ابھی تو اس دکھی جہاں میں موت ہی کا دور ہے
ابھی تو جس کو زندگی کہیں وہ چیز اور ہے

ابھی تو خون تھوکتی ہے زندگی بہار میں
ابھی تو رونے کی صدا ہے نغمۂ ستار میں

ابھی فضائے دہر کی کروٹوں پہ کروٹیں
ابھی تو سوتی ہیں ہواؤں کی وہ سنسناہٹیں

کہ جن کو سنتے ہی حکومتوں کے رنگِ رخ اڑیں
چپیٹیں جن کی سرکشوں کی گردنیں مروڑ دیں

ابھی تو سینۂ بشر میں سوتے ہیں وہ زلزلے
کہ جن سے جاگتے ہی موت کا بھی دل دہل جائے

ابھی تو بطنِ غیب میں ہے اس سوال کا جواب
خدائے خیر و شر بھی لا نہیں سکا تھا جس کی تاب

ابھی تو گود میں ہیں دیوتاؤں کی وہ ماہ و سال
جو دینگے بڑھ کے برقِ طور سی حیات کو جلال

ابھی رگِ جہاں میں زندگی مچلنے والی ہے!
ابھی حیات کی نئی شراب ڈھلنے والی ہے

ابھی چھری ستم کی ڈوب کر اچھلنے والی ہے
ابھی تو حسرت اک جہان کی نکلنے والی ہے

ابھی تو گھن گرج سنائی دیگی انقلاب کی
ابھی تو گوش بر صدا ہے بزمِ آفتاب کی

ابھی تو پونجی واد کو جہان سے مٹانا ہے
ابھی تو سامراجوں کو سزائے موت پانا ہے

ابھی تو دانت پیستی ہے موت، شہریاروں کی
ابھی تو خوں اتر رہا ہے آنکھ میں ستاروں کی

ابھی تو اشتراکیت کے جھنڈے گڑنے والے ہیں
ابھی تو جڑ سے کشتِ خوں کے نظم اکھڑنے والے ہیں

ابھی پرولتاریت کا راج ہونے والا ہے
ابھی بہت جہاں میں کام کاج ہونے والا ہے

مگر ابھی تو زندگی مصیبتوں کا نام ہے
ابھی تو نیند موت کی مرے لئے حرام ہے

یہ سب پیام اک نگاہ میں وہ آنکھ دے گئی
بیک نظر کہاں کہاں مجھے وہ آنکھ لے گئی

(نوٹ) یہ نظم بستر علالت سے لکھی گئی

فیض احمد فیض

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں

اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمّت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بیکار دہکتا ہوا درد!
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

کمال صدیقی

نیا دور!

ابھی شیرازۂ ہستیٔ انسانی پریشاں ہے!! ابھی چہرہ سے کچھ کچھ بدحواسی ہی نمایاں ہے!
ابھی ہر موجِ بحرِ زیست کی طوفاں بداماں ہے ابھی تو دستِ وحشت میں گریباں ہی گریباں ہے
ابھی تو جامۂ ہستی کو حاجت ہے رفوگر کی
ضرورت ہے ابھی تو رہروِ ہستی کو رہبر کی
ابھی تہذیبِ انسانی کے دامن میں ہیں شمشیریں ابھی تو خوابہائے زیست کی الٹی ہیں تعبیریں
تکبر کی ابھی سننے میں آجاتی ہیں تکبیریں ابھی آئینۂ دل میں نظر آتی ہیں تقصیریں
ابھی تو موت ہی کی زندگی پر چھاؤں پڑتی ہے
یہ رستہ روک کر ہر ہر قدم پر پاؤں پڑتی ہے
ابھی تو محفلِ ہستی میں جامِ شر اچھلتے ہیں! سیاست کی جبیں پر سینکڑوں فتنے مچلتے ہیں
سرودِ زندگی سے آتشیں نغمے نکلتے ہیں! ابھی تو چشمِ نم سے خون کے چشمے ابلتے ہیں
کبھی آغاز کا رونا کبھی انجام کا رونا!
ابھی رونا ہے انساں گردشِ ایام کا رونا!
ابھی راہیں تمدن کی بہت زائد ہیں پیچیدہ سکونِ زندگی کی حسرتیں اب تک ہیں خوابیدہ

ابھی تو چہرۂ ہستی ہے غمگین اور رنجیدہ — ابھی اوہام کے معبود کا انساں ہے گرویدہ
ابھی اس خود غرض انسان کو جینا نہیں آتا
ابھی جامِ شرابِ زندگی پینا نہیں آتا!
ابھی انسان قدرت سے بغاوت کر نہیں سکتا — ابھی انسان فطرت پر حکومت کر نہیں سکتا
ابھی وہ بے نقاب اسرارِ قدرت کر نہیں سکتا — ابھی انسان آزادی کی جرأت کر نہیں سکتا
ابھی قابو میں انساں کے نہیں ہے توسنِ ہستی
ابھی تو موت ہے سرمایہ دارِ خرمنِ ہستی
ابھی انسان خود کو مشتِ خاکی ہی بتاتا ہے — ابھی انسان خود کو بندۂ مجبور پاتا ہے
بشر سازِ مقدر پر ابھی تک گیت گاتا ہے — ابھی تدبیر کے میدان میں وہ لڑکھڑاتا ہے
ابھی تو منزلوں ہے منزلِ مقصودِ انساں کی
ابھی تو چھاننا ہے خاک صدیوں تک بیاباں کی
ابھی آئی نہیں انسان کی طینت میں خودداری — جھلکتی ہے ابھی ہر فعل سے انساں کے بیزاری
ابھی تو ہستیٔ انساں پہ مدہوشی سی ہے طاری — ابھی آئی نہیں ہے نرگسِ ہستی میں بیداری
"نیا دور" آنے والا ہے اک ایسا بھی عالم میں
جو پھونکے گا نئی اک روح آکر ابنِ آدم میں

بھنور سے موت کے کشتیِ انسانی بچائیگا !!
غلامی سے اجل کی جو کہ انساں کو چھڑائیگا
حقیقی معنوں میں انساں کو جو جینا سکھائیگا
عروجِ ارتقا کا راستہ انساں کو دکھائیگا

ابھی گہوارۂ ہستی میں انساں کی حقیقت کیا؟
یہ عالم ہے کہ جیسے دامنِ صحرا میں اک قطرا

"نیا دور" آنے والا ہے اک ایسا بزمِ عالم میں
جو پھونکے گا نئی اک روح آکر ابنِ آدم میں
جو انساں کی خوشی ملحوظ رکھے گا ہر اک غم میں
جو پھر پڑنے نہ دیگا ایک خم بھی زلفِ برہم میں

"وہ دور" آنے کو ہے، انساں کو جو انساں بنائیگا
حقیقت میں جو اس دنیا کو جنت کر دکھائیگا

مسعود اختر جمال

نذر

یہ سوز و ساز و تب و تاب نذر کرتا ہوں
مسرتوں کا حسیں خواب نذر کرتا ہوں
حیاتِ خضر و غمِ جاوداں کا ذکر ہی کیا
متاعِ لمحۂ نایاب نذر کرتا ہوں
نویدِ زیست۔ پیامِ نشاط۔ رازِ سکوں
فسانۂ دلِ بیتاب نذر کرتا ہوں
خزاں کے جور سے اجڑے ہوئے چمن کیلئے
بہارِ لالۂ شاداب نذر کرتا ہوں

نظر کو سازِ محبت کا سوز دیتا ہوں!
نفس کو شعلۂ مضراب نذر کرتا ہوں

(۲)

ڈوبا ہو جس کی لَے میں زمانے کا سوز و ساز　　وہ زندگی نواز ترانہ ہی اور ہے
جس میں دھڑک رہا ہو دلِ کائنات بھی　　اُس دل کی دھڑکنوں کا فسانہ ہی اور ہے
ہوں جس کے دامنوں میں سحر کی تجلیاں　　وہ خواب، وہ طلسم شبانہ ہی اور ہے

اس عہد میں نہ ڈھونڈھ تو توہم پرستیاں
یہ دَور ہی جُدا۔ یہ زمانہ ہی اور ہے

معین احسن جذبی

موت

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اِک دُھوم مچا لوں تو چلوں
اور اِک جامِ مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں

ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دُھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دُنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

وہ مِرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

بس تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کے محل!
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
آنسوؤ، تم نے تو بیکار بھگویا دامن

اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سُکھالوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور

ایسے وہموں سے بھی اَب خود کو نکالوں تو چلوں

مقبول احمد پوری

کیفِ سکون

مری زندگی کا رُخِ حسیں یہی ایک کاوشِ جستجو
کہ تری نگاہ میں آسکوں

مجھے دردِ دل سے عطا ہوئی یہی ایک لذتِ آرزو
تجھے کاش اپنا بنا سکوں

یہ پتہ نہیں مری جستجو میں بھی کوئی رنگِ مجاز ہے
مری عقل اس کو پا نہ سکی
یہ خبر نہیں مری آرزو کو ترے خیال سے ساز ہے
مجھے عقل یہ نہ بتا سکی

کبھی پستیاں مرے سامنے، تو بلندیاں مری آہ میں
مرے جی کو پھر بھی قرار ہے
مری زندگی کی یہ ٹھوکریں، نہ تھکا سکیں مجھے راہ میں
یہی میرے دل کا وقار ہے

کبھی نغمہائے فراق میں ترے کیفِ غم کو ملا لیا
ترے غم کو یوں اپنا لیا
کبھی تیرے حسن کا ماجرا، تری یاد ہی کو سُنا لیا!
اُسے اک فسانہ بنا لیا

یونہی حسرتوں کے دفور میں ہوئی یاد تیری متاعِ دل
کوئی غم جسے نہ بھلا سکے
یونہی بیخودی کے سرور میں گئی تیری ایک جھلک سی مل
کبھی عقل جس کو نہ پا سکے

منیب الرحمٰن۔ ایم۔ اے

آنسو

جامِ تمنا شاید چھلکا
یا پلکوں سے آنسو ڈھلکا

یہ بھی تبسم، وہ بھی تبسم
ایک ترانہ، ایک ترنم
نظروں کا خاموش تلاطم

سینے میں یہ ڈوب نہ جائے
پلکوں سے دامن پر آئے

دیکھا فضا میں تارا ٹوٹا
ہاتھوں سے پیمانہ چھوٹا
رات کا سپنا نکلا جھوٹا

پیروں میں زنجیر نہ ہوگی
خندہ زن تقدیر نہ ہوگی
آہوں کی تعبیر نہ ہوگی

آگے بڑھ دامن پھیلائے
مانگ لے جو کچھ مانگا جائے

یوسف ظفر

مدافعت

ابھی جلیں گے ہزاروں چراغ آنکھوں میں
ابھی فراغ میسّر نہ ہو سکے گا مجھے!

ابھی ستاروں کو دامن نہ تھامنا ہوگا
ابھی اُٹھے گا وہ شعلہ جو تھام لے گا مجھے

(۲)

فضا خموش ہے، طوفان آنے والا ہے!
بگولے بننے کو ہیں وہ مہیب پیڑ ابھی
اُکھڑنے والی ہیں وہ سرد سرد دیواریں
نگاہ مہر سے جاری ہے۔ جن کی چھیڑ ابھی

(۳)

تمہارے ہاتھ بھی سینے پہ رکھ نہیں سکتا
کہاں انھیں مرے دل کے سکوں سے نسبت ہے
حنائی ہاتھ ــــ بھڑکتے ہوئے کئی شعلے
بھڑکتے شعلوں کو سیلابِ خوں سے نسبت ہے

(۴)

فضا بھی میرے مخالف، ہوا بھی میرے خلاف
کوئی اُفق مری نظروں کو سازگار نہیں
اُبھر رہی ہیں گزشتہ غموں کی تصویریں!
گئے دنوں کی حقیقت بھی خوشگوار نہیں
مگر ــــ میں سانس تو لیتا ہوں جی بھی سکتا ہوں
جو پی رہا تھا وہی زہر پی بھی سکتا ہوں

شمیم کرہانی

گنگا کے دھارے سے!

کیوں گنگا کے دھارے!
تجھ میں چمکیں تجھ میں جھمکیں، روپ گگن کے تارے
تجھ میں لہکیں تجھ میں مہکیں، جل منڈل کے پیارے
اور ترے رنگیل پر تٹ ہیں، دھرتی کے مہ پارے
کیوں گنگا کے دھارے

کالی ریں آکاش بھینکر، بادل گھیرے گھیرے!
نرمل جل کے شیتل تٹ پر، سنگینوں کے پہرے!
سندر دیپ جلائے پریمی، کیسے تیرے دوارے
کیوں گنگا کے دھارے

کومل انگ، منورم جیون، سندر سوانگ رچائے
اپرادھی جوالا کی لو ہیں، کمھلائے مرجھائے
جگنو چنگاری بن جائیں، پھول نہیں انگارے
کیوں گنگا کے دھارے

چندرمکھی سونے کی نوکا، تیری گود میں کھیلے
"آکاشی گنگا" سے برسیں، دھن کے جوہی بیلے

"کال بھون" میں پھڑکیں تڑپیں، جیون کے شہ پارے
کیوں گنگا کے دھارے

گرم بگولوں بیچ تھرائے، ساون کی ہریالی
کوئل کوکے، روئے پپیہا، کانپے ڈالی ڈالی!
کیسے مور مگن منگل سے، جنگل میں جھنکارے
کیوں گنگا کے دھارے

نینوں کے تارے بجھ بجھ کر، گودیں آنکھیں موندیں
ممتا کی کومل چھاتی سے ٹپکیں خون کی بوندیں
چاند بگولوں میں چکرائے، آگ میں لوٹیں تارے
کیوں گنگا کے دھارے

نیرے بیری، انگاروں سے پیٹ کا دوزخ پاٹیں
بھوک اور پیاس میں بوٹی نوچیں، خون پسینے چاٹیں
تیری چھاگل دن دن چھلکے، سسکیں پیاس کے مارے
کیوں گنگا کے دھارے

مردوں نے دم توڑ دیئے، بے آس ہوئیں مہلائیں
جان سے بھی پیارے بچوں کو بیچ رہی ہیں مائیں
تپتی کوکھ، دہکتی چھاتی، جلتے ہوئے گہوارے
کیوں گنگا کے دھارے

کلیاں دیں رنگت بھر بھر کر، بھونرا رنگ اُڑائے

شبنم کے موتی چن چن کر، سورج روپ سجائے
"ہنسا" شیش محل بنوائے، ہم دیں خون کے گارے
کیوں گنگا کے دھارے

لوٹ چکی ہے تو بھی دنیا، جیون کی ہر آشا!
اُجڑی مانگ، کلائی سونی، دولہن ہے یا لاشا!
ماتم کی لے میں کھو جائیں، جیون کے جھنکارے
کیوں گنگا کے دھارے

ہم تو بھوکے ہم تو پیاسے، تیرے "تٹ" رکھوالے
تو نے کس ہردے سے بانٹے لاکھ کے میٹھے پیالے
سوکھے ہونٹ ہمارے کانپیں، دنیا لے چٹخارے
کیوں گنگا کے دھارے

کب تک روئیں، کب تک جھیلیں یہ طوفانی دھاریں
کٹ کٹ کر گر پڑتی ہیں، ہردے کی دیواریں
رات کے سناٹے میں جیسے ٹوٹیں تیرے کگارے!
کیوں گنگا کے دھارے

گھر شمشان کھنڈر سی گلیاں، بستی ہے یا پرتی
تو نے اب جو دیر لگائی، جل جائے گی دھرتی
تجھ کو پیاسے نینوں سے، تکتے ہیں تیرے پیارے
بڑھ گنگا کے دھارے

مُردوں کے سنسان نگر میں، جیون رس برسا دے
فاقوں کی ماری دُنیا کو امرت میں نہلا دے
دھرتی کی چھاتی سے اُبلیں جیون کے فوارے
بڑھ گنگا کے دھارے

جھوم کے آنچل سے برسا دے، ساون کی ہریالی
کوئل کوکے گائے پپیہا، جھومے ڈالی ڈالی!
چھاؤں بڑھے، ہریالی پھیلے پیڑ اُگیں چھتنارے
بڑھ گنگا کے دھارے

تیری دھار میں تنکا بن کر سارے دُکھ بہہ جائیں
کال سے چھٹ کر دکھیا جیون تیری مہما گائیں
پھوٹ پڑے سنگیت دلوں سے چھیڑ دے من کے اکتارے
بڑھ گنگا کے دھارے

سُکھ کے دن سے اُٹھ ہی جائے دُکھ کی رین کا ڈیرا
جائے جلد اندھیرا جائے، آئے جلد سویرا
سارا ٹھاٹھ پڑا رہ جائے، لاد چلیں بنجارے
بڑھ گنگا کے دھارے

١١٥٠٢